۱۸۵۷

جن بہادر اولوالعزم مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء کی
جنگِ آزادی کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا،
اور وطن کو آزاد کرانے میں جان کی بازی لگائی
ان کے مفصل حالات۔ اردو زبان میں پہلی
اور یگانہ کتاب

اٹھارہ سو ستاون کے

مجاہد

غلام رسول مہر

1 جعفر تھانیسری انڈیمان بھیج گئے — میرزا امیر احمد کا ساتھ دینے میں ہوئی — 8, 295

2 مہر — میں فرقہ وار تفریقات کا قائل نہیں — 10

3 جنرل بخت خان — 22/63

4 انقلابیوں نے شکست کھائی — 63, 67

5 تاریخی واقعات میں قیاسات یا افسانہ سازیوں کیلئے قطعاً گنجائش نہیں — 80

6 مولوی امام بخش — 108

7 مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ — سرکاری ملازم — 111

8 وہابی — بخت خان — وہابی کا لفظ — 166/167

9 مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ کا فتویٰ — 181, 206

10 مولانا فضل خیر آبادی علیہ الرحمۃ اور اسماعیل دہلوی — 203

11 پادری فنڈر — عربی فارسی میں مہارت تھی — 240

12 علماء کے نزدیک یہ ہنگامہ مذہبی تھا — 244

13 دیوبند نے جنگ آزادی میں حصہ لیا — 250

14 مہر صاحب کی تذکرہ رشیدیہ کی صفائی پیش کرنا — لفظ سرکار — 254

15	بانو قدسی کے وارنٹ گرفتاری ۔	256
16	سبز رنگ کی پگڑیاں ۔ سبز رنگ کے گنبد ۔	272
17	یا علی پکارنا	272
18	وہابی بھی بدعتی ہیں کو سزائیں	299
19	امام احمد رضا صاحب بریلوی علیہ الرحمۃ عورتوں کا کافی کی تحقیق بمہ شوق عشق	311
20	محمد بخش ۔	316

۱۸۵۷ کے مجاہد

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پرنٹرز

جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

اشاعت سوم ——— ۱۹۷۰ء

اشاعت چہارم ——— ۱۹۸۲ء

اشاعت پنجم ——— ۱۹۹۱ء

مقامِ اشاعت:

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز،

۱۹۹- سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۵۴۰۰۰/۲

ISBN – 969 – 31 – 0146 – 4

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

"۱۸۵۷ء کی ترتیب و تسوید شروع کی تھی تو اس کتاب کا خواب و خیال بھی نہ تھا، جسے اب پیش کر رہا ہوں۔ یقیناً بعض ممتاز مجاہدینِ آزادی کے حالات سامنے تھے لیکن یہی تصور رکھے بیٹھا تھا کہ عام واقعات کے سلسلے میں وہ حالات بھی آجائیں گے یا ضرورت محسوس ہوگی تو مناسب مقامات پر چند سطروں کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

نصف سے زیادہ کتاب مرتب ہو چکی تو احساس ہوا کہ اس میں افراد و رجال کے سیر و سوانح کو شامل کرنا سراسر تکلف ہوگا، اس لیے کہ اصل کتاب اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے تاریخی ہے اور سیر و سوانح کا دائرہ بالکل جداگانہ ہے۔ دونوں میں پیوند کی حیثیت وہی ہوگی جیسے دو مختلف المزاج جنسوں میں امتزاج پیدا کیا جائے۔

بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ افراد و رجال پر الگ کتاب لکھی جائے۔ جن عزیمت دوست اور حمیت پرور شخصیتوں نے اپنی بیش بہا زندگیاں مقصدِ آزادی کے لیے وقف کیں، ان کی ایک بڑی یادگار یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے سوانح مرتب ہو جائیں اور عام لوگ ان سے عزیمت و حمیت کے سبق لیں۔ یہ حقیقت بھی محتاجِ تصریح نہیں کہ سیر و سوانح کے ذریعے سے قوموں کے لیے بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے غالباً فراہم نہیں ہو سکتا۔

ناانصافی ہوگی اگر میں اعتراف نہ کروں کہ مجھ سے پیشتر بھی بعض اصحاب نے اس کام کے سرانجام دینے کی کوشش کی، لیکن اول معلومات کا سرمایہ بہت معمولی تھا۔ دوم انداز ترتیب شخصیتوں کی عظمت کے شایان شان نہ تھا۔ سوم شخصیتوں کے انتخاب میں ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی پر حصر نہ کیا گیا بلکہ بعض ایسی شخصیتوں کو بھی شامل کر لیا گیا جو یقیناً حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا پا کر انڈیمان پہنچیں، تاہم یہ ابتلا ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں پیش نہ آئی تھی، بلکہ وہ معاملہ بالکل جداگانہ تھا۔ مثلاً:

۱۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری یقیناً انڈیمان بھیجے گئے اور وہاں انھوں نے اٹھارہ سال گزار دیے، تاہم یہ سزا سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کو امداد دینے کے سلسلے میں ہوئی تھی نہ کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں۔

۲۔ مولانا احمد اللہ صادق پوری، مولانا یحییٰ علی صادق پوری اور مولانا عبدالرحیم صادق پوری بھی محولہ بالا "جرم" میں سزایاب ہوئے تھے، نہ کہ ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں شرکت کے باعث، اگرچہ مولانا محمد جعفر کے متعلق ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء میں چند آدمیوں کے ساتھ دہلی پہنچے تھے اور چند روز وہاں لڑے نیز مولانا احمد اللہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں کچھ مدت نظر بند رہے تھے۔

۳۔ منیر شکوہ آبادی کو بھی یقیناً انڈیمان بھیجا گیا تھا، لیکن انھیں یہ سزا اس لیے ملی تھی کہ مصطفیٰ بیگ نام ایک شخص نے نواب جان طوائف کو قتل کر کے تزویر سے منیر کو الجھا دیا تھا چنانچہ منیر اپنے طویل قصیدۂ ابتلائیہ میں کہتے ہیں:

مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں تھے
کی روش میں بدروش نے چورشاں پر سے
کر کے خونِ ناحق نواب جان
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

ہے کہیں کہیں فروگذاشتیں محسوس ہوں یا بعض پہلو تشنۂ تکمیل نظر آئیں تاہم اُمید ہے کہ خوانندگان کرام اس کتاب کو مختلف حیثیتوں سے اپنی نوعیت کا بالکل نیا مرقع پائیں گے۔

یہ اُن بلند ہمت اور اولوالعزم شخصیتوں کے سوانح ہیں جنھوں نے اس دور میں آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی، جب اصل مقصد کے لیے تحسین و ستائش کا اندازہ بھی عوام کے ذہنوں میں صورت پذیر نہ ہوا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کی غرض یہ نہ تھی کہ دنیا کی زبان پر اُن کے کارناموں کی مدح کے ترانے جاری رہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ملک آزاد ہو جائے اور اجنبی حکومت کا نقشِ باطل حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ انھوں نے شدید تاریکی میں زندگی کے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اپنا خونِ حیات اس بے پروائی سے بہایا کہ دوسروں کو شاید اس طرح پانی کے چند چُلو بہانے میں بھی تکلف ہو۔

ان کے کارناموں پر ایک سَو سال کی مدت گذر چکی ہے۔ ان میں سے بیشتر کے نام بھی غالباً اکثر اصحاب کو معلوم نہ ہوں۔ انگریزوں نے اقتدار و تسلط بحال ہو جانے کے بعد ان مساکین کی بے مثال قربانیوں کے مرازنے کا موقع ہی نہ آنے دیا، لیکن خلوص و بے نفسی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی قدرت ضائع نہیں ہونے دیتی۔ انھوں نے تربیت بڑے عمل کے لیے قدم اٹھایا تھا اور جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر آج سب کے سامنے ہے۔ حق و انصاف کی میزان کا فیصلہ یہی ہے کہ انھوں نے جو بیج ۱۸۵۷ء میں بویا تھا اور اسے اپنی زندگی کے لہو سے سینچا تھا، وہ نوّے سال کے بعد پھل لایا۔ انگریزی حکومت اپنی بے پناہ قاہری کے باوجود مٹ گئی۔ آج ہر احسان شناس قلب میں ان مجاہدین کی یاد تازہ ہونی چاہیے جو ایک سو سال پیشتر انتہائی مشکلات میں اپنا فرض احسن طریق پر بجالاتے ہوئے خوفناک میرآزمائیوں کی منزل سے کامیاب و کامگار گزر گئے۔

میں ادائے فرض کے سلسلے میں فرقہ وار تفریقات کا قائل بھی نہیں اور انھیں پسندیدہ بھی نہیں سمجھتا، لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس جہاد میں سب سے بڑھ کر اور صدرِ درجہ ممتاز حصہ مسلمانوں

نے لیا، بلاشبہ وہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جوشِ آزادی کی بے کرانی اور قربانیوں کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ دوسرے لوگ باوجود کثرتِ تعداد ان سے منزلوں پیچھے رہ گئے یہ اس دور میں مسلمانوں کی شانِ امتیاز تھی، جب اس ملک پر بے بسی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں جس قوم کا حصہ سب سے بڑھا ہوا تھا اور جس نے عارضی ناکامی کے بعد نقصان بھی سب سے زیادہ اٹھائے، کیا یہ امید بے جا سمجھی جائے گی کہ اس جہاد کی یادگار منانے کی سب سے بڑھ کر حق دار قوم وہی ہے!

مسلم ٹاؤن - لاہور
۱۰ر مارچ ۱۹۵۷ء

ہنری لارنس تمام معاملات کا مالک و مختار تھا۔ وہ ۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو مہلک طور پر زخمی ہوا اور مر گیا اس کے بعد محصورین سے بیلی گارد خالی کرا لینا قطعاً مشکل نہ تھا، کیونکہ وہاں کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

۲- جنرل ہیوے لاک نے اواخر جولائی میں فتح کانپور کے بعد لکھنؤ کی طرف پیش قدمی شروع کی، لیکن پہلی ہی منزل سے اس کے لیے لوٹ جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔

۳- ۴ر اگست اور ۱۲ر اگست کو ہیوے لاک نے پھر پیش قدمی کی، لیکن دونوں مرتبہ مراجعت ہی پر مجبور ہوا۔

۴- ہیوے لاک کی جگہ آوٹرم مقرر ہوا۔ یہ دونوں اواخر ستمبر میں لکھنؤ پہنچے، لیکن نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ یہ لوگ بھی محصورین کے ساتھ محصور ہو گئے۔

۵- نومبر میں سر کالن کیمبل نے پیش قدمی کی۔ کامیاب بھی ہوا لیکن کان پور کے حالات اتنے نازک تھے کہ لکھنؤ کو سنبھالے رکھنے کی ہمت نہ پڑی اور محصورین کو نکال کر واپس چلا گیا۔

۶- فروری ۱۸۵۸ء میں دوبارہ پیش قدمی کی اور مارچ میں لکھنؤ فتح ہوا۔

گویا اہل لکھنؤ کو کم و بیش نو مہینے کی مہلت مل گئی تھی، لیکن حضرت محل کی کوششوں کے باوجود کچھ بھی نہ ہو سکا۔ کاش حضرت محل عورت کی جگہ مرد ہوتی یا اس کے سے اثر و رسوخ اور عزم و ہمت کا کوئی مرد قیادت کے لیے موجود ہوتا!

فوج کی دل دہی

مختلف لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر مردانگی اور استقامت احمد اللہ شاہ اور شہزادہ فیروز شاہ نے دکھائی۔ حضرت محل برابر فوج کا دل بڑھاتی رہتی تھی۔ ایک جھڑپ میں جنرل بخت خاں کی توپیں چھن گئیں اور اُسے بہت رنج ہوا۔ حضرت محل نے فرمایا۔ توپوں کے چھن جانے کا رنج نہ کرو، میں تمہیں اور دوں گی[1]۔ ۲۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہیوے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۱۲

سکین[1] اور کپتان گارڈن[2] نے مشورہ دیا کہ فوراً دتیا چلے جائیں اور اپنے
آپ کو وہاں کے راجا کی حفاظت میں دے دیں۔ لیکن یہ بھی نہ کیا گیا! انجام کار
انھیں ہماری فوج، پولیس اور جیل کے ملازموں نے موت کے گھاٹ
اتار دیا۔[3]

یہ خط واقعۂ قتل سے رانی کی برأت کا روشن ثبوت ہے۔

تین لاکھ کا مطالبہ

کن کیڈ کا بیان ہے کہ قلعے کے تخلیے اور انگریزوں کے قتل سے فراغت کے بعد تمام انقلابی رانی کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہم دہلی جانا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں خرچ کے لیے تین لاکھ روپے دیں۔ رانی نے جواب دیا کہ میں تین برس ہوئے ریاست سے الگ ہو چکی ہوں میرے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے؟ یہ جواب درست تھا۔ رانی کے پاس حقیقتاً نقد روپیہ نہ ہو سکتا تھا خصوصاً اس لیے کہ جو پنشن اسے ملتی تھی، اس میں سے متوفی راجا کے قرض کے روپے بالاقساط کٹتے جاتے تھے۔ نیز اس واقعے سے ثابت ہے کہ نہ رانی نے انقلابیوں کے کسی فعل میں حصہ لیا تھا اور نہ وہ انھیں اُکسانے اور برانگیختہ کرنے کی ذمہ دار تھی۔ اگر ایسا ہوتا

---

1. SKENE جھانسی میں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھا۔
2. GORDON جھانسی میں ڈپٹی کمشنر تھا۔
3. کن کیڈ کی کتاب ص ۱۳۰، ۱۳۲۔ خط سے ظاہر ہے کہ مارٹن خود ۵ جون کے وقت قلعے میں موجود تھا وہ کس طرح بچ نکلا؟ اس بارے میں کچھ پتا نہیں میرا خیال ہے رانی کے بھیجے ہوئے بندوقچیوں نے اس لیے باہر بھیج دیا ہوگا کہ انگریز ان پر اعتماد کر سکتے تھے۔ تاہم رانی اس کے سوا ان کی کیا مدد کر سکتی تھی؟ مارٹن کے اس خط کا سراغ نہیں مل سکا مگر رانی کا مرہٹی سوانح نگار لکھتا ہے کہ میں نے خود یہ خط دیکھا تھا جو غالباً دامودر کے بیٹے کے پاس تھا، اور وہ اسی بزار، اندور میں رہتا تھا۔ اس کا ذکر ایس۔ این۔ سین نے بھی کیا ہے (۱۸۵۷ء، انگریزی ص ۲۷۹، ۲۸۰)

تو انقلابی اس انداز میں روپے کا مطالبہ کیوں کرتے ؟

تاہم انقلابی ایسے کسی جواب پر مطمئن نہ ہو سکتے تھے کہ رانی کے متبنٰی دامودر گنگادھر راؤ رقیب یعنی رام چندر راؤ کا متبنٰی سداشیو راؤ ریاست کا طلب گار بیٹھا ہے چنانچہ انھوں نے رانی سے کہہ دیا کہ اگر تین لاکھ نہ ملیں گے تو ہم محل کو آگ لگا دیں گے اور سداشیو راؤ کو مسندِ حکومت پر بٹھا دیں گے۔

رانی کے لیے یہ دھمکی سخت تشویش کا باعث بن گئی۔ محل کو آگ لگ جاتی تو جو اندوختہ اس کے پاس باقی رہ گیا تھا، وہ بھی جاتا۔ نیز انگریز اگرچہ جھانسی پر قابض ہو چکے تھے، تاہم رانی کو امید تھی کہ ریاست اُسے واپس مل جائے گی۔ اگر سداشیو راؤ مسند نشین ہو جاتا تو رانی کی یہ امید بھی ختم ہو جاتی۔

اعلانِ حکومت

بہ ہر حال اس دھمکی سے متاثر ہو کر اس نے ایک لاکھ کے جواہرات انقلابیوں کے حوالے کر دیے۔ جواہرات مل گئے تو انھوں نے رانی کی حکومت کا اعلان کر دیا اور منادی ہو گئی: خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم رانی لکشمی بائی کا۔[1]

حقیقت میں وہ دامودر کی مختار و سرپرست تھی، نہ کہ مستقل حکمران۔ یہ امر بہ طور خاص توجہ کا محتاج ہے کہ رانی نے اپنی حیثیت سے کبھی تجاوز نہ کیا اور دامودر کے حقوق کو کبھی خفیف سا گزند بھی نہ پہنچنے دیا۔ بلکہ وہ جب تک زندہ رہی، اس نے دامودر کو سینے سے لگائے رکھا اگر کوئی بچہ رانی کے بطن سے بھی ہوتا تو اس سے زیادہ پیار اور ماتا کا مرجع ہرگز نہ بن سکتا، جس کے مظاہرے رانی لکشمی بائی نے دامودر کے تعلق میں کیے۔

رانی کی پوزیشن

اب یہاں اس امر پر تھوڑی سی گفتگو کر لینی چاہیے کہ رانی کی پوزیشن کیا تھی! ہم نے مانا کہ واقعات قتل کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوتی

[1] کن کیڈ ص ۶۰۵ [2] ساورکر ص ۱۱۶

تھی۔ لیکن کیا اس امر کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے کہ رانی نے فوجیوں کو سرکشی پر ابھارا یا خود انھیں برطیبِ خاطر کوئی امداد دی؟ کیا اس بات کی کوئی شہادت ملتی ہے کہ وہ ابتدا ہی سے انگریزوں کے خلاف لڑنے پر تلی بیٹھی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اس کے لیے ایک عمدہ موقع بہم پہنچا دیا تھا؟ مستند تاریخی دستاویزوں کے مطابق ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔

واقعات کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ ۵ جون کو جھانسی میں ہنگامہ برپا ہوا۔ رانی کا اس ہنگامے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے پاس جو سو پچاس آدمی تھے، وہ کسی ہنگامے کی روک تھام کا فرض انجام نہ دے سکتے تھے۔

۱۔ انگریزوں نے جتنے گواہ مہیا کیے، ان میں سے کسی ایک کا بیان رانی کو کسی بھی درجے میں مجرم ثابت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ان بیانات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل بے قصور تھی۔

۲۔ امان اللہ خاں سپاہی کو وسطِ ہند کا پولٹیکل ایجنٹ رابرٹ ہیملٹن قابلِ اعتماد قرار دیتا ہے۔ اس کی شہادت یہ ہے کہ سرکشی سے قبل کسی نے رانی سے مشورہ نہ کیا۔ پھر ڈرا دھمکا کر دوسروں کو ساتھ ملایا اور وہ لوگ رانی کے محل کی طرف گئے تو بھری ہوئی توپیں ساتھ لے گئے۔ گویا بزور رانی سے روپے اور آلات و اسلحہ کی مدد حاصل کی۔

۳۔ ۱۲ جون کو سرکشوں نے دہلی کا راستہ لیا۔ اس وقت سے رانی نے انگریزوں کے پاس مفصل اطلاعات بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے ساگر اور بندھیل کھنڈ کے پولیٹکل ایجنٹوں یا آس پاس کے دوسرے ذمہ دار انگریزوں کے پاس رپورٹیں بھیجیں۔ جب اس کے خلاف اوڑچھا کے راجا نے فوج کشی کی تو انگریزوں سے مدد مانگی۔ ایک پولٹیکل ایجنٹ نے اسے لکھ بھی دیا تھا کہ مالیہ وصول کرو، فوج بھرتی کرو اور انتظامی کاروبار جس حد تک ممکن ہو سنبھالے رکھو۔

۴۔ جب رانی کو یقین ہو گیا کہ دشمنوں کی دراندازی سے انگریز اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے کے لیے تیار نہیں اور جھانسی کا نام سنتے ہی ان پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے حالانکہ رنج دہ واقعات کے لیے وہ ذمہ دار نہ تھی تو اس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا جو ہر لحاظ سے عزیمت اور غیرت و حمیت کے عین مطابق تھا پھر وہ زندگی کے آخری سانس تک اسی پر چٹان کی طرح جمی رہی۔

حقیقت سے اعراض کیوں؟

حقیقت یہی ہے جو ہم نے صاف صاف عرض کر دی۔ اس کا کوئی پہلو رانی کی عظمت کے منافی نہیں ہمیں نہ افراط کا شکار رہنا چاہیئے اور نہ تفریط کا۔ نہ رانی کو ابتدا ہی سے انگریز دشمنی کا پیکر بنا کر پیش کرنے کے درپے ہونا چاہیئے اور نہ ایک خاص وقت تک انگریزوں سے لڑنے میں تامل کی بنا پر یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ رانی کو جنگ آزادی میں علمبرداری کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ ابتدا میں ہرگز لڑنا نہ چاہتی تھی مگر جب اس نے لڑنے کا ارادہ کر لیا تو ایک لمحے کے لیے بھی تذبذب کو راہ نہ دی اور خطرے کے ہر مقام میں سب سے آگے رہی۔ اس عزیمت پر کون فخر نہ کرے گا، اور اس مردانگی کے لیے کس کے دل کی گہرائیوں سے تحسین و آفرین کی لہریں نہ اٹھیں گی!

ضروری نہیں کہ ہر انسان پہلے ہی مرحلے میں تمام حقائق کا صحیح اندازہ کر لے۔ جب اندازہ ہو جائے تو پھر جان و دل سے راہ عمل پر گامزن ہو جانا منافی عظمت نہیں بلکہ بہر حال مستحق تحسین ہے۔ یقیناً رانی بڑی عظیم المرتبت تھی ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں اس کی شانِ علییت کا مقابلہ احمد اللہ شاہ یا شہزادہ فیروز شاہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ مقصد اعلیٰ ہو اور اس کے لیے انسان جاں بازی کا نہ محض عہد کر لے بلکہ بے تامل جان دے دے تو کون ہے جس کے دل میں اس قربانی کے لیے انتہائی احترام کا جذبہ پیدا نہ ہوگا؟ رانی نے آزادی کے لیے میدان جنگ میں جان دی۔ کیا یہ برتری اور عظمت کی سب سے بڑی دستاویز نہیں!

انگریزوں سے لڑوں حقیقت یہ ہے کہ اب رانی کے سامنے انگریزوں کے قلع قمع کے سوا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ جھانسی سے بے دخل ہو چکی تھی۔ ۲۱ مارچ سے ۴ اپریل تک اپنے بہادروں کو آزادی کے لیے بے دریغ جانیں قربان کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اب وہ یا تو اصل مقصد کو پورا کرنے کی آرزومند تھی یعنی انگریزوں کا استیصال یا چاہتی تھی کہ خود بھی میدان جنگ میں جان دے دے۔

تانتیا ٹوپے بھی کالپی ہی آ گیا تھا۔ راؤ صاحب نے فوج کو پریڈ کا حکم دیا۔ ان کے روبرو پُرجوش تقریر کی۔ پھر تانتیا ٹوپے کو سالار بنا کر ہدایت کی کہ انگریزی فوج کے مقابلے پر نکلے تانتیا فوج لے کر کونچ پہنچا، جو کالپی سے ۴۲ میل کے فاصلے پر جھانسی کی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ رانی بھی تانتیا کے ساتھ گئی۔

ہیو روز نے جھانسی کی حفاظت کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ۲۰ اپریل کو کالپی کی جانب کوچ کیا۔ ۲ مئی کو اس نے ایسی جنگی چال چلی کہ تانتیا نے شکست کھائی اور رانی کے لیے کونچ میں ٹھہرے رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ پھر کالپی چلی گئی تانتیا والدین سے ملنے کے لیے چرکی پہنچ گیا[1] کالپی میں سخت مقابلہ ہوا لیکن انقلابیوں نے وہاں بھی شکست کھائی اور شہر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انقلابی فوج بے ترتیب تھی اور وہ جم کر مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ نیز سالاری اور قیادت کے جوہر سب سے بڑھ کر رانی لکشمی بائی میں موجود تھے لیکن اُسے خود مختاری کے ساتھ جنگ کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔

---

[1] میلسن کا بیان ہے کہ فوج کے نہ صرف طبقے کونچ کی شکست کا ذمہ دار تانتیا کو ٹھہراتے تھے بعض کہتے تھے کہ جھانسی کے رسالے نے بھی حق استقامت ادا نہ کیا۔ رسالے کے سپاہی یہ عذر کرتے تھے کہ ہمارے لیے رانی کا بچاؤ ہر شے پر مقدم تھا (جلد پنجم ص ۱۲۵) اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں، میرا تاثر یہی ہے کہ تانتیا میدان عمل میں گھبرا جاتا تھا۔

ساورکر کا بیان ہے۔ تانتیا نے اگرچہ ظاہر یہ کیا تھا کہ والدین سے ملنے جا رہا ہوں، لیکن حقیقتاً وہ اس فکر میں تھا کہ اگر کالپی کو خالی کرنا پڑا تو کوئی دوسرا مرکز تیار کر لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ گوالیار گیا۔ درباریوں، سرداروں اور دوسرے اکابر سے مل کر انھیں ہم نوا بنایا، پھر راؤ صاحب کے پاس جا کر گوالیار پہنچنے کی تحریک پیش کی:

> ۲۰ مئی کو انقلابی محل پہنچے۔ محل کے کارداروں نے انھیں روکنا چاہا۔ انقلابیوں نے جواب دیا: "تم روکنے والے کون ہو؟ ہم پیشوا کے نمائندے ہیں۔ ہم سوراج اور سودھرم کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اہل دنیا کو جان لینا چاہیے کہ ہم پیشوا ہیں۔ ہماری جنگ سوراج اور سودھرم کے لیے ہے۔"

جنگ مرار

انگریزی فوج قبضۂ کالپی کے بعد مطمئن ہو گئی تھی کہ اب زیادہ لڑائی بھڑائی کی ضرورت پیش نہ آئے گی لیکن جب سنا کہ انقلابی گوالیار پر قابض ہو چکے ہیں تو ہیوروز خود کالپی سے چلا۔ بریگیڈیئر سمتھ کو جو چندیری کے قریب تھا حکم بھیجا کہ جلد سے جلد کوٹہ کی سرائے پہنچو، جو گوالیار سے پانچ میل جنوب میں ہے۔ ۱۶ جون کو رابرٹ نیپیئر بھی ہیوروز سے آ ملا۔ یہی وہ جرنیل ہے جس نے بعد ازاں وسطی ہند میں انقلابیوں سے لڑائیاں کیں، اسی نے تانتیا کو گرفتار کیا تھا۔ اُسے بعد ازاں لارڈ نیپیئر آف میگڈالا کا خطاب ملا۔

سندھیا کے فوجی ہیوروز کی رہبری کر رہے تھے۔ وہ مرار پہنچا تو اچانک اس پر گولے اور گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ مگر تھوڑی دیر میں مرار کی انقلابی فوج نے شکست کھائی۔ ہیوروز اس میدان میں بھی کامیاب رہا۔

ل ساورکر ص ۳۰۹ [illegible] نے لکھا ہے کہ [illegible] نائب کوتوال جھنور کا باشندہ تھا۔ جو نانا صاحب پیشوا ہی کا [illegible] وطن تھا۔ [illegible] گوالیار میں رہتا تھا۔ نائب کوتوال سے ہر حال امداد و اعانت ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔

آخری رسوم

اب رانی کے آخری سانس تھے۔ اس کا وفادار ملازم رام چندر راؤ دیشمکھ قریب ہی تھا۔ وہ اس شیر دل مجاہدۂ آزادی کو اٹھا کر پاس کی جھونپڑی میں لے گیا۔

گنگا داس باوا نے پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈا پانی پلایا اور بستر کا انتظام کر دیا۔ بزم جنگ کی یہ دیوی خون میں نہائی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔ رانی نے مرتے وقت جو ہدایات کی تھیں، ان کے مطابق رام چندر راؤ نے دشمن کی نگاہوں سے بچ بچا کر گھاس کا انبار فراہم کیا، اس پر رانی کی ارتھی رکھی۔ رانی کا مردہ جسم آگ کی نذر ہو گیا۔[1]

تانتیا نے گرفتاری کے بعد اپنے سوانح کے متعلق جو یادداشت تیار کی تھی اس میں لکھا تھا کہ رانی کی ارتھی رام راؤ گوبند نے جلائی تھی۔[2]

ملازم کی زبانی

فارسٹ لکھتا ہے کہ رانی کی وفات کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں لیکن اس کے ملازم کا بیان زیادہ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہ ذیل میں درج ہے:

رانی کا معمول تھا کہ مردانہ لباس پہن کر فوجوں کی قیادت کرتی۔ سرخ کرتہ، سرخ پتلون اور سفید پگڑی۔ اس لباس میں کوئی شخص اس کی صنف نہ پہچان سکتا۔ اس کے متوفی شوہر کی دو خواصیں بھی ایسی ہی فوجی لباس میں ہر لمحہ ساتھ رہتی تھیں۔ وہ دونوں رانی اور خواص، پھول باغ کے دمدمے کے پاس بیٹھی ہوئی شربت پی رہی تھیں۔ بے قاعدہ پلٹن کے چار سو آدمی قریب ہی بیٹھے تھے۔ اس وقت

---

[1] ساورکر ص ۴۰۰، یہ بیان تانبا رانی کے مرہٹی سوانح نگار کی کتاب پر مبنی ہے جس نے واقعات کی خوب چھان بین کی تھی۔

[2] ملکسن جلد سوم ص ۳۷۰ (ضمیمہ ۱)

خطرے کا بگل بجاکر (انگریزی فوج کے) مسلح سوار آپہنچے۔ وہ چالیس پچاس ہوں گے "باغی" بھاگ نکلے۔ صرف پندرہ کے قریب اپنی جگہ جمے رہے۔ رانی گھوڑے پر سوار ہوئی۔ اس کے گھوڑے نے نہر کود جانے میں تامل کیا۔ اس وقت رانی کے پہلو میں گولی لگی۔ پھر سر پر ایک زخم آیا۔ لیکن وہ گھوڑا دوڑاتی ہوئی نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں دم نکل گیا اور گر پڑی۔ اور پاس ہی کے ایک باغ میں اس کی ارتھی جلائی گئی اس وقت برہمنی خادمہ کے چہرے پر بھی تلوار کا زخم آیا لیکن شہر تک پہنچ گئی۔ ایک فقیر اور مسلمان کوتوال نے اس کی تیمارداری کی۔ انہیں ہاتھوں میں دم دیا۔ بعد ازاں مسلمہ کی حیثیت میں اُسے دفن کیا گیا[1]

ڈاکٹر سین

ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ رانی کے گولی لگی تو تانتیا ٹوپے اور راؤ صاحب بھی پاس تھے۔ بیس منٹ بعد اس نے وفات پائی۔ اسے اٹھاکر پھول باغ کی طرف لے گئے۔ راؤ صاحب پاس تھے۔ یہ لاش کو پالکی میں لایا تھا۔ اور پھول باغ کے درمیان جو ندی ہے اس پر لے گئے۔ وہاں بہ اطمینان آخری رسم ادا کرنا ممکن نظر نہ آیا تو لاش کو اٹھا کر دیوار پر سے باغ کے اندر پہنچایا اور ایک درخت کے نیچے جلانے کا انتظام کیا۔ ابھی رسم ختم نہ ہوئی تھی کہ انگریزی فوج کا حملہ ہو گیا۔ جو لوگ رسم چھوڑ کر بھاگے ان میں سے چھ سات مارے گئے۔ بہرحال لاش جل چکی تھی لیکن پھول چنے نہ گئے تھے[2]

رانی کی شخصیت

رانی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کشیدہ قامت، نہایت حسین وجمیل، صدرجہ سرگرم و مستعد، خودداری اور حسن کی پکی تھی۔ جھانسی سے گوالیار تک روز بروز کر جتنی لڑائیاں پیش آئیں، قریباً ان سب میں رانی سے مقابلہ ہوا۔ لہٰذا

---

[1] فارسٹ جلد سوم ص ۲۰۱-۲۰۲ ہومز نے بھی لکھا ہے کہ رانی کی وفات قرابین کی گولی لگنے سے ہوئی تھی

[2] ایضاً ص ۲۰۵

غور طلب امور

مگر اب کا اتفاق ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں عظیم اللہ خاں نے اس انگریزی گھرانے میں سیکھیں، جہاں وہ ادنیٰ حیثیت میں ملازم ہوا تھا۔ پھر سکول میں داخل ہوا اور معلم بنا۔ انگریزی کا سیکھنا سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن فرانسیسی کس ذریعے سے سیکھی اور کیوں کر اس میں کمال پیدا کیا؟ کیا اس انگریز گھرانے میں فرانسیسی بھی بولی جاتی تھی یا کیا گورنمنٹ ہائی سکول کانپور میں فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی!

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کو فرانسیسی سے کیوں دلچسپی ہوئی جبکہ اس زبان میں مہارت پیدا کر لینے سے اُسے اچھی ملازمت حاصل کرنے میں کوئی مدد نہ مل سکتی تھی!

ہمارے سامنے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ تاہم یہ واقعہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کا حافظہ بڑا ہی غیر معمولی ہوگا اور اُسے قدرت نے اخذ و فہم کی خاص صلاحیت عطا کی ہوگی کہ خانسامے یا باورچی کی حیثیت میں مالکوں سے جو کچھ سنتا رہا، وہ ٹھیک ٹھیک اس کے ذہن نشین ہوتا رہا۔

انگلستان اور فرانس کے سفر میں عظیم اللہ خاں کی ایک غیر معمولی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اسے دیکھ کر عورتیں بے حد متاثر ہوتی تھیں۔ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جس انگریز گھرانے میں اس نے ملازمت اختیار کی تھی، وہاں بھی کوئی ایسا ہی ذریعہ انگریزی اور فرانسیسی سیکھنے کا باعث بن گیا؟ ان سوالوں کا جواب قیاسات ہی کی بنا پر دیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ واقعات کا مجموعہ اور حقائق کا ذخیرہ ہے، اس میں قیاسات یا افسانہ بافیوں کے لیے قطعاً گنجائش نہیں۔

نانا سے تعلق

انتظام اللہ خاں شہابی فرماتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں ذہین و تیز طبع تھا۔ انگریزی زبان میں مہارت کے متعلق اسے اتنی شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ گورنر کانپور آتے تو ان کے لیے سپاسنامہ عظیم اللہ خاں ہی سے تیار کرایا جاتا۔ اس وجہ سے مقامی حکام میں بھی اس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا اور جب نانا راؤ کو ایک اچھے

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۵ء سے کئی سال پیشتر بمقام لکھنؤ گھسیاری منڈی میں رہتے تھے۔[1]

تائب فرماتے ہیں:-

ہوئے شاہ حضرت کے انعام سے رہے تھوڑے دن عیش و آرام سے

سفر کی وہاں سے بھی رخصت ملی پئے جنگ و پیکار اجازت ملی!

چلے کرشش و جستجو کی طرف گئے بلدۂ لکھنؤ کی طرف

سفر لکھنؤ

لکھنؤ کا سفر اختیار کیا تو مریدین کی ایک جماعت بھی احمد اللہ شاہ کے ہمراہ تھی بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ آپ کان پور میں عظیم اللہ خاں سے بھی ملے اور کچھ مدت وہاں ٹھہرے رہے۔

۲۔ کان پور سے آگرہ ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے اور گھسیاری منڈی میں قیام کیا۔

۳۔ اس زمانے میں مولانا فضل حق خیر آبادی لکھنؤ میں سرکاری ملازم تھے۔ انھوں نے بھی شاہ صاحب سے ملاقات کی۔ خدا جانے شاہ صاحب نے کیا کہا کہ مولانا لکھنؤ کی ملازمت چھوڑ کر الور چلے گئے۔

تائب نے لکھا:

نصاریٰ سے جو جنگ پیکار تھا!
ہر اک شخص سے اس کا اظہار تھا

---

[1] بحوالہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۲ مولوی سید امیر علی مرحوم ساکن فیض آباد کو منڈولا سے لکھنؤ چھوڑنے میں مسلمانوں کی ایک جماعت سے ... تو شہید ہو گئے تھے۔ وہ دوسری صورت سے ... پہنچ گئے۔ انگریز افسر فوج نے مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ ... نومبر ۱۸۵۵ء ... واقعات قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۰۲ [2] تائب شاہ ... معلوم ہوتا ہے کہ جنگ و پیکار کی اجازت لکھنؤ ... جب ... کے لیے مولوی سید امیر علی شہید ہو گئے تھے۔

یک۔ مولوی احمد اللہ کی شہادت اور راجا پوایں کو پچاس ہزار کے انعام کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے:

برطانیہ کے اس سخت ترین دشمن کا غیر متوقع انجام سرکاری کے تمام جاری جیوش کے مقابلے میں رذیل کمینہ کے غداری کو پورا کرنے کے لیے زیادہ موثر ثابت ہوا[۱]

مرجدار بالکل بجا کہتا ہے کہ احمد اللہ شاہ تمام تحسینات کا مستحق تھا تمام لیڈروں میں صرف وہ تھا جس کی اپنی کوئی غرض نہ تھی اور صرف وہ تھا جسے انگریزی حکومت کے خلاف ذاتی شکایت کوئی نہ تھی[۲] مولانا ابوالکلام آزاد بھی یہی فرماتے ہیں کہ چند مستثنیات کے سوا سب لوگوں نے ذاتی وجوہ سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں حصہ لیا اور مستثنیات میں سے نہایت ممتاز دو شخص ہیں، ایک احمد اللہ اور دوسرا تانتیا ٹوپے[۳]

آپ نے یہ بھی فرمایا: "امن فوجی قوت کے بل پر قائم نہ ہوا۔ صرف اس وجہ سے قائم ہو کہ احمد اللہ شاہ کے بعد ملکی قوتوں کو منظم کر کے لڑانے والا کوئی نہ رہا۔

مولانا فضل حق

مولانا فضل حق مرحوم خیرآبادی نے بھی مولانا احمد اللہ کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:

اس موقع پر مسلط نصاری کے خلاف لڑنے کے لیے ایک اولوالعزم کامل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خیرات و مبرات اور سعادات و حسنات کا خاصا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا، وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر، رسول عالم

---

[۱] MAC MUIN
[۲] مرجدار ص ۱۰۰
[۳] سرجارج کی کتاب ص ۲۲۰
[۴] سین کی کتاب کا پیش لفظ ص ۲۶

اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے
لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی ہلّے میں شکست دے دی[1]

اس کے بعد مولانا فضل حق، شاہ صاحب کی شہادت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ
انگریز بھاگ کر ایک قصبے کے ہندو زمیندار کے مستحکم حصار میں پناہ گزیں ہوئے اور اپنے اکابر
کے پاس پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ چنانچہ مدد آگئی۔ احمد اللہ شاہ سے کافر زمیندار نے داؤ کھیلا۔
قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں یعنی مجاہدین اور انگریز کے درمیان مقابلہ برپا
ہوگا تو میں چار ہزار کا لشکر لے کر مجاہدین کی امداد کے لیے آجاؤں گا۔ احمد اللہ شاہ نے اس
وعدے پر اعتماد کر کے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ ہوا یہ
کہ سامنے سے نصاریٰ نے گولیاں برسائیں۔ پیچھے سے اس غدار زمیندار نے آتشباری
کی۔ اس طرح احمد اللہ شاہ نے شہادت پائی اور ان کی جماعت نے بھی سردار کے نقشِ قدم
پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔

شہادت کی سابقہ کیفیت کے مقابلے میں یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے، تاہم عام
روایت وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یہ روایت صرف مولانا فضل حق کی ہے۔

مولانا کا حلیہ

میلسن نے احمد اللہ شاہ کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولوی
صاحب موصوف کا قد لمبا، جسم دبلا پتلا لیکن خوب مضبوط تھا
آنکھیں بڑی بڑی، بھویں گھنی، ناک کا بانسا اونچا اور جبڑے پتلے تھے[2]۔ مفتی انتظام اللہ
نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ سر کے بال کالے تھے اور زلفیں دونوں کاندھوں پر لٹکتی رہتی
تھیں[3]

---

[1] الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان ص ۲۰۰ [2] میلسن جلد چہارم ص ۲۰۹

[3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۴۴

جنرل بخت خاں

ابتدائی حالات

جنرل بخت خاں کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم نہ ہو سکے صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ ان کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا اور اسے نجیب الدولہ روہیلہ کے خاندان سے قرابت قریبہ تھی۔ اس خاندان پر نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں اور پوتے غلام قادر خاں دونوں کے عہد میں گردش کا دور آیا۔ یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ کب؛ لیکن ایسے ہی کسی ناسازگار وقت میں خاندان کے افراد بکھرے تو عبداللہ خاں نے اودھ کے ایک ضلع سلطان پور میں اقامت اختیار کر لی۔

وہ بڑا وجیہہ اور خوش رو تھا اور بہادری میں بھی یگانہ مانا جاتا تھا۔ غالباً انہیں اوصاف کی بنا پر شجاع الدولہ والی اودھ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہات کا مرکز بن گیا۔ شادی ہو گئی۔ اس طرح پریشان روزگار عبداللہ خاں کا رشتہ والیان اودھ کے خاندان سے استوار ہو گیا[1]

بخت خاں کا بیان

منشی جیون لال نے اپنے روزنامچے میں ۱۱ مارچ ۱۸۵۷ء کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

[1] حیات علامہ فضل حق خیر آبادی بحوالہ بہادر شاہ ظفر ص ۵۲۹

ہوا۔ البتہ میرٹھ میں سپاہ کا ہنگامہ شروع ہوا تھا تو وہ بریلی میں مقیم تھا[1]

ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سپاہ میں بے چینی کے آغاز پر توپ خانے کو انگریز اپنی تحویل میں لے لینا چاہتے تھے۔ جس شخص نے رو رو کر احتجاجیں کیں اور بڑے بڑے افسروں کی ہمدردیاں اسے حاصل ہو گئیں۔ وہ بخت خاں ہی تھا جو سرکشی کے بعد بریلی کے برگیڈ کا کمان دار بنا اور دہلی پہنچا تو اسے سپہ سالارِ اعظم بنا دیا گیا[2]

افکار میں تبدیلی

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں کے افکار و عزائم پہلے وہ نہ تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نمایاں ہوئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ وہ اپنے پیر مولوی سرفراز علی کے حکم کی بنا پر انگریزوں سے بیزار ہو گیا[3] افسوس کہ مفتی صاحب نے اس کی تفصیل بیان نہ فرمائی، یعنی یہ کہ مولوی سرفراز علی کون تھے؟ بخت خاں نے کہاں ان کی بیعت کی؟ انھوں نے کیا حکم دیا تھا اور کیا کہہ کر اُن کے دل میں انگریزوں کے خلاف جذبہ بیدار کیا تھا؟

ہمیں مولوی سرفراز علی کے مفصل حالات کہیں سے نہ مل سکے۔ ان کا ذکر یقیناً مختلف مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً مولوی ذکاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

> دلّی میں جب باغی سپاہ کے افسر علی بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبد الغفار و مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا میرِ لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا[4]

---

[1] سیل کن جلد دوم ص ۲۰۲ — [2] ایضاً ایضاً ص ۲۰۳

[3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۳۳ — [4] سیل کن جلد سوم ص ۲۰۳

بالکل یہی مضمون حکیم احسن اللہ کے اس بیان میں درج ہے جو بہادر شاہ کے مقدمے میں دیا گیا تھا۔

میرا احساس یہ ہے کہ مولوی ذکاء اللہ نے جو کچھ لکھا، حکیم احسن اللہ خاں کے بیان ہی سے ماخوذ ہے اور حکیم صاحب کا درجہ طبابت یا بعض دوسرے علوم میں کتنا ہی بلند ہو تاہم ان کی دینی معلومات بہت ہی معمولی سی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے "وہابی" کا لفظ ان مسلمانوں کے لیے استعمال کیا، جو سید احمد شہید کے مسلک پر کاربند تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب کوئی اسلامی سرزمین کسی غیر مسلم طاقت کے قبضے میں چلی جائے تو مسلمانوں پر جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کے سرگرم داعی تھے۔ اسی لیے حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا کہ بخت خاں خود "وہابی" تھا، جیسا کہ محمد غوث خاں اور مولوی محمد خاں "وہابی" تھے۔ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی بھی "وہابی" تھے۔ اگر سید صاحب سے ان کا تعلق نہ تھا تو کم از کم یہ ضرور ماننا چاہیے کہ وہ جہاد کو بھی نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی طرح اسلام کے ارکان میں سے سمجھتے تھے اور اس پر عمل ضروری جانتے تھے۔ بعض بیانات میں مولوی سرفراز علی کو جونپوری بتایا گیا ہے لیکن ان کے حالات نہیں بتائے گئے۔

بریلی میں پرچم آزادی

بریلی میں بے چینی تو اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب میرٹھ اور بعض دوسرے مقامات میں ہنگامے کے آغاز کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حالات نزاکت کی آخری منزل پر پہنچ گئے اور ہنگامے کی ابتدا آتش زنی سے ہوئی۔ مختلف روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان بہادر خاں (ابن ذوالفقار خاں ابن حافظ رحمت خاں)، محمد شفیع اور بخت خاں اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

۱؎ بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ۲۰۲

صبح تک پل سے بریلی کی فوج گزر سکے گی۔ بادشاہ نے احمد قلی
خاں کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا۔[1]

بادشاہ سے ملاقات

۲ جولائی کے حالات میں مرقوم ہے کہ نواب احمد قلی خاں فوج بریلی کے استقبال کی غرض سے گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں، جنرل صمد خاں، ابراہیم علی خاں، غلام علی خاں اور دوسرے اصحاب بھی تھے۔ احمد قلی خاں اور بخت خاں نے بارگاہ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج کو متعین کر دیا جائے۔

بادشاہ نے پہلے سے حکم جاری کر رکھا تھا کہ شہر کے باشندوں کو ہرگز نہ ستایا جائے۔ اس موقع پر فرمایا:

> میرے احکام صادر کرنے سے فائدہ کیا ہوگا؟ ان احکام کی تعمیل ہوتی نہیں ورنہ یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو انہیں نافذ کر سکے۔ میرا فرمان یہ ہے کہ انگریزوں کے لیے یہاں رہنے کی گنجائش نہ چھوڑی جائے۔

بخت خاں نے عرض کیا کہ میں سپہ سالاری حیثیت میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں تاکہ عام ڈسپلن بحال ہو جائے۔ بادشاہ نے نشان مروت کے طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بخت خاں اپنی فوج میں پہنچا تو صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات

---

[1] روزنامچے ص ۱۲۰، ۱۲۲۔ میٹکاف نے اردو روزنامچوں کا ترجمہ انگریزی میں کرتے وقت ناموں کے متعلق متعدد مقامات پر غلطیاں کی ہیں۔ شلاً یہاں "محمد علی خاں" نام لکھا تھا حالانکہ نواب احمد قلی خاں تھے یعنی زینت محل کے والد اور بہادر شاہ کے خسر۔

قبول فرما لی ہیں، اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کون کون میرا حکم ماننے کے لیے تیار ہے؟ سب نے بخت خاں کی اطاعت و وفاداری کا حلف اُٹھایا۔

منصب سالاری! پھر اس نے دوبارہ بادشاہ سے ملاقات کی۔ عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کے داروغہ کو حکم ملا کہ کالا محل[1] بخت خاں کی فوج کے لیے خالی کر دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ پھر بخت خاں نے شہزادہ میرزا مغل سے ملاقات کی:

> محمد بخت خاں کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ "جنرل" کا خطاب دیا گیا اور اسے تمام افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ منادی کرا دی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خاں سے ہدایت حاصل کریں۔ میرزا مغل کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

محمد بخت خاں نے عرض کیا کہ اگر شہزادوں نے شہر میں لوٹ مار کی کوشش کی تو میں ان کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ بادشاہ نے فرمایا:

> تمہیں پورا اختیار ہے جس کام میں بہتری نظر آئے، وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کے کوتوال کو اطلاع دے دی گئی اگر اب لوٹ مار ہوئی تو تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔[2]

بہادر شاہ کے ایک فرمان سے مترشح ہوتا ہے کہ بخت خاں کو "معز الدولہ" کا خطاب

---

[1] اصل نام "مکان محل" تھا اور عام لوگ اسے کالا محل کہتے تھے۔

[2] روزنامچے ص ۱۳۴ ، ۱۳۵

دارو غہ پر ایسا ہی الزام لگا اور لوگوں نے س کی پچاس ہزار کی جائداد لوٹ لی بخت خاں کو پتہ چلا تو سپاہی اس ظلم کی روک تھام کے لیے بھیج دیے تھے[1]

۵۔ بہادر شاہ کی ایک بڑی کوشش یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ نہ پڑنے پائے۔ اسی مصلحت کے پیش نظر اُس نے شہر میں ذبیحہ گاؤ بند کرایا تھا[2]

۶۔ بخت خاں نے مختلف راجاؤں اور والیانِ ریاست سے بھی خط و کتابت کا انتظام کیا تھا اور بعض کی عرض داشتیں اسی کے ذریعے سے دربار میں پیش ہوئی تھیں۔

اختلاف اور رقابتیں

افسوس کہ شہزادوں کو بخت خاں کی یہ کارگزاری اور یہ عزت ایک آنکھ نہ بھائی۔ اُنھوں نے مختلف ذریعوں سے دراندازیاں شروع کر دیں۔ ان کے خاص کارندوں نے شکایتیں کیں کہ ہمیں بخت خاں کی قیادت منظور نہیں۔ ہم مرزا مغل ہی کو اس بڑے اعزاز کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ پھر کہا گیا کہ جب تک بخت خاں نہیں آیا تھا، انگریزوں سے روزانہ لڑائیاں ہوتی تھیں، اور جب سے بخت خاں نے دلی میں قدم رکھا ہے، لڑائیاں بالکل بند ہو گئی ہیں۔ یہ الزام سر سر غلط تھا، اس لیے کہ ابتدا میں انگریزی فوج بہت تھوڑی تھی اور اس کے پاس ساز و سامان بھی کم تھا۔ اس کے تمام مورچے بھی تیار نہ ہوئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی تعداد اور ساز و سامان کی مقدار ترقی پذیر رہی۔ یقیناً انگریزوں پر حملہ جتنا آسان ابتدائی دور میں تھا، اتنا آخری دور میں نہیں رہا تھا۔ تاہم لڑائیاں برابر ہوتی رہیں۔

---

[1] روزنامچے ص ۱۲۶   [2] ایضاً ص ۱۷۰

منشی جیون لال نے ۴ اگست کے حالات میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے کئی ذی وقار فوجی افسر بلائے اور ان سے کہا کہ میں نے میرزا مغل اور جنرل بخت خاں کو فوج کی قیادت کے لیے تجویز کیا ہے۔ تمھیں ان میں جو پسند ہو، اُسے منتخب کرو۔ ہمارے لشکری ہر وقت بڑ ہانکتے رہتے ہیں کہ ہم انگریزوں سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں لیکن لڑتے نہیں اور واپس چلے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ انگریز دہلی لے لیں گے اور مجھے قتل کر دیں گے۔ افسر اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضور ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں، ہم جانیں لڑا دیں گے۔ بخت خاں نے کہا اب خدا کے فضل سے میں ضرور کامیابی حاصل کروں گا۔ میری تجویز یہ ہے کہ انگریزوں پر علی پور کی جانب سے حملہ کروں۔[1] گویا بخت خاں آخری دم تک اس کوشش میں سرگرم رہا کہ جس انگریزی فوج نے دہلی کا محاصرہ کر رکھا تھا، اس کا تعلق پنجاب، انبالہ اور فیروزپور سے توڑ دیا جائے۔ ۵ ستمبر کے حالات میں مرقوم ہے کہ بخت خاں میگزین کو شہر سے باہر لے جانا چاہتا تھا اور اس نے چالیس توپوں کے لیے دمدمے بنانے کا کام شروع کر رکھا تھا۔[2]

انتظام جہاد

بخت خاں کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی ایک مرتبہ بعض علما نے جامع مسجد میں جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ بخت خاں نے تمام علما کو جمع کر کے کہا کہ جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیں۔ چنانچہ یہ فتویٰ جاری ہوا۔ مقصود یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں مذہبی جوش پیدا ہو۔ سرسید نے لکھا ہے کہ ایسا کوئی فتویٰ حقیقتاً موجود نہ تھا اور بعض علما کے دستخط بنا لیے گئے۔

---

[1] دو روزنامچے ص ۱۸۱

[2] ایضاً ص ۲۲۲

۵۔ ۱۸۷۵ء میں معلوم ہوا کہ شہزادہ فیروز شاہ میرزا محمد بیگ کے نام سے [illegible] مکہ معظمہ چلا گیا ہے۔ یہ اطلاع اس مخبر نے دی جو شہزادے کے ساتھ [illegible]

۶۔ جنوری ۱۸۷۷ء میں وہ مکہ معظمہ پہنچا اور ۱۷ دسمبر ۱۸۷۷ء کو [illegible] جنت میں پہنچ گیا۔ گویا مکہ معظمہ کی خاک پاک میں آسودگی پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ [illegible] عمر میں ایک آنکھ کی بینائی قریباً زائل ہو چکی تھی اور ایک [illegible] سے [illegible] لگا تھا۔ شریف مکہ نے جو وظیفہ مقرر کر دیا تھا، اسی پر [illegible] رہتا تھا۔

۷۔ شہزادے کی بیوہ نے وظیفے کے لیے حکومت ہند سے درخواست کی [illegible] ۱۸۸۰ء میں اس کے لیے پانچ روپے ماہوار اس شرط پر مقرر ہوئے کہ [illegible] جائے۔ لارڈ رپن کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وظیفہ ایک سو روپے ماہوار [illegible] دو نومبر ۱۸۸۰ء سے پوری رقم ایک سو روپے کے حساب سے یکمشت دلوادی۔[1]

امیر مجاہدین سے ملاقات

اوپر مذکور ہے کہ شہزادہ ۱۸۶۰ء میں سوات [illegible] تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ سوات نہیں بلکہ بونیر گیا تھا تاکہ سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ سے ملے جو اس زمانے میں باجکٹہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ اپریل ۱۸۶۰ء کا واقعہ ہے۔

کچھ معلوم نہیں کہ شہزادہ اور امیر عبداللہ کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ قیاس یہ ہے کہ شہزادہ اس خیال میں ہوگا کہ مجاہدین انگریزوں سے برسر جنگ ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ ان کی تعداد بھی کم ہے اور ساز و سامان بھی معمولی ہے تو وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

عام طور پر مشہور تھا کہ شہزادے کی وفات ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ میرے عزیز دوست

---

[1] سیٹن کی کتاب ص ۲۰۱-۲۰۲

ایران سے ملا باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا ایک جید عالم شاہ صاحب سے مناظرے کے لیے دہلی آیا۔ شاہ صاحب نے اس کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ شام کے وقت مولانا فضل حق اس عالم کی خدمت میں پہنچے اور مزاج پرسی کے بعد علمی گفتگو شروع کر دی پہلے افق المبین پر اعتراضات کیے، جن کا جواب ایرانی عالم نہ دے سکا۔ پھر خود ہی شافی جوابات دیے۔ آخر میں کہا کہ میں شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد ہوں اور کفش بردار ہوں۔ ایرانی عالم یہ سن کر اتنا متاثر ہوا کہ مناظرے کا ارادہ ہی ترک کر دیا[1] سوچا کہ جس شخص کے شاگردوں کا یہ حال ہے، وہ خود خدا جانے کیسا ہوگا۔

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مولانا کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ دیکھا کہ حقہ بھی پی رہے تھے اور شطرنج بھی کھیل رہے تھے، ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو افق المبین کا درس بھی دے رہے تھے اور تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان فرماتے جاتے تھے[2]

درس و تدریس

اس زمانے میں قاعدہ تھا کہ طالب علم سے فراغت کے بعد درس بھی دلوایا جاتا۔ اس کے بغیر حاصل کردہ علوم میں پختگی نہ آتی تھی چنانچہ مولانا فضل حق نے بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا فضل امام نے ایک بڑی عمر کے طالب علم کو بھی آپ کے حوالے کر دیا تھا جو غالباً کند ذہن تھا۔ اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا، پھر کتاب اٹھا کر پھینک دی اور درس سے اٹھوا دیا۔ وہ مولانا فضل امام کی خدمت میں پہنچا اور کیفیت عرض کی، چنانچہ مولانا فضل حق بلائے گئے۔ مولانا فضل امام نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ دستارِ فضیلت دور جا پڑی، پھر فرمایا:

تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا۔ نازو نعم میں پرورش پائی۔ جس کے سامنے کتاب رکھی، اس نے خاطر داری

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۲۲، ۲۲۱ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴

مولانا کی زندگی علم وفضل میں مولانا وقت کے ممتاز ترین اصحاب میں سے تھے لیکن افکار و خیالات یا معتقدات کی بنا پر ان کی حیثیت بہت ہی معمولی تھی۔ زندگی بھی امیرانہ تھی، جسے جفاکشی یا مجاہدے سے کوئی مناسبت نہ تھی دہلی میں میرزا غالب سے گہری دوستی تھی اور میرزا کی پوری زندگی لاابالیانہ تھی۔ امتناع نظیر تو نہیں اور امکان نظیر کے بارے میں شاہ اسمٰعیل شہید سے نزاع چھیڑ دی، جو بالکل بے محل تھی۔ اس سلسلے میں مشیت و قدرت کا فرق نظرانداز کر دیا۔ بڑے نازک مزاج تھے شطرنج کا بہت شوق تھا۔ غرض ان کا عام طریقہ وہی تھا، جو اس زمانے کے امرا کا تھا اور کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آرام طلبی، تن آسانی اور امیری کے جنجال سے نکل کر آپ جفاکش مجاہدوں کے حلقے میں پہنچ جائیں گے۔

مولانا اور سیاست جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں مولانا کی ابتدائی زندگی میں کبھی بھی سیاسی امور کی طرف توجہ نہ ہوئی ان کا خاص ذوق یہ تھا کہ جہاں رہیں عزت سے رہیں۔ اچھی تنخواہ ملے، اور آرام و اطمینان کی زندگی بسر کریں۔ علم کا ذوق رکھنے والوں کو درس بھی دے دیا کریں اور بس۔ چنانچہ اسی اسلوب و نہج پر ان کی زندگی گزری۔ غالباً آخری دور میں بعض دوسرے حساس و دیدہ ور اصحاب کی طرح ان پر بھی انگریزی تسلط کی خرابیاں منکشف ہوئیں۔ انھوں نے سمجھا کہ انگریز سب کو عیسائی بنا لینے کے درپے ہیں اور ان کے نزدیک اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کی یہی بہترین تدبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے انگریزوں کے متعلق طبیعت میں تکدر پیدا ہوا، جو آخری دم تک بڑھتا ہی گیا۔

محرکات مخالفت مولانا نے انگریزوں کی مخالفت کے جو محرکات اپنی کتاب میں بیان کیے ہیں، انھیں یہاں خلاصۃً درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں

تمہید ان دونوں بزرگوں کے حالات یک جا بیان کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ آزادی کے جہاد میں ان دونوں نے اکٹھے کام کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل ایک مذہبی جہاد میں یہ رفیق تھے، دوسرے جنگ آزادی ناکامی پر منتج ہوئی تو دونوں یکے بعد دیگرے حجاز پہنچ گئے اور باقی زندگی اسی مقدس سرزمین میں پوری کرکے مالکِ حقیقی سے جا ملے اور دونوں کے زیادہ تر حالات اسی دور کے متعلق ملتے ہیں جب انھوں نے اکٹھے کام کیا۔

مولانا رحمت اللہ مولانا کا وطن کیرانہ ضلع مظفرنگر تھا، اسی لیے کیرانوی مشہور ہوئے۔ والد کا نام مولوی نجیب اللہ۔ جد کا مسکن پانی پت تھا جہاں ان کی خاصی جائداد بھی تھی۔ یہ بعد میں ضبط کر لی گئی۔ ان کے جدِ اعلیٰ شیخ عبدالرحمٰن عثمانی کازرونی بتایا گیا ہے۔ مولانا کے خاندان میں سے ایک صاحب مو محمد عارف الاسلام، مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کو اپنے اجداد میں شمار کرتے ہیں۔

مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی، پھر دہلی چلے گئے، جو اس زمانے میں علم و فضل کا سب سے بڑا مرکز تھا اور وہاں بے شمار درسی

پہلے کلکتہ کے ہسپتال میں متعین ہوئے۔ پھر انھیں آگرہ بھیج دیا گیا۔ وہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تاج گنج کے محلہ کاغذیاں میں رہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے انھیں "اکبرآبادی" لکھا گیا۔

یکساں ذوق اور دوستی

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی کے علمی اور عملی ذوق میں یکسانی کے کئی پہلو تھے۔ مثلاً دونوں آزادیٔ وطن کے شیدائی تھے۔ جب موقع آیا دونوں نے جنگ میں سرگرم حصہ لیا۔ دونوں کو عیسائیت کے مآخذ پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور پادریوں کے ساتھ مناظروں میں ان کی شہرت دُور دُور پہنچ چکی تھی۔ اسی وجہ سے دونوں کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔

عیسائیت کی تبلیغ

ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا تو ہر ملک سے عیسائی مبلغ ہندوستان پہنچ گئے اور انھوں نے جگہ جگہ مشن قائم کر لیے۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں کے باشندوں کو جلد سے جلد عیسائی بنا لیا جائے تاکہ انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہو جائیں۔ اس غرض سے چھاپے خانے قائم کر لیے گئے تھے جہاں عیسائیت کی تبلیغ کے متعلق ضروری کتابیں بکثرت چھاپ چھاپ کر نشر کی جاتی تھیں اور ان کی قیمت بہت کم تھی۔ اخبار اور رسالے بھی نکلنے لگے تھے۔ لطف یہ کہ کتابیں مختلف جگہ کی مروجہ زبانوں میں چھاپی جاتی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔ دوسرے مذاہب خصوصاً اسلام پر اعتراضات بھی کیے جاتے تھے اور مناظرے بھی ہوتے تھے۔

پادری فنڈر

۱۸۵۴ء میں یورپ سے فنڈر نام ایک پادری آیا، جسے عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل تھی وہ اکثر اسلامی کتابیں بالواسطہ یعنی ترجموں کے ذریعے سے نہیں بلکہ بلاواسطہ پڑھ چکا تھا۔ ہمارے عام علماء بیچارے سادہ سے لوگ تھے تورات و زبور اور انجیل یا عیسائیت کی دوسری کتابوں سے چنداں آگاہی نہ تھی۔ وہ

عیسائیوں کے اعتراضات سے واقفیت تھی۔ اس لیے وہ مناظروں سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے اور فنڈر کے متعلق مشہور ہو چکا تھا کہ کوئی اس کے اعتراضات کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے عیسائیت کے متعلق ایسی معلومات حاصل کر لی تھیں، جو اکثر پادریوں کو بھی حاصل نہ تھیں، پھر عیسائیت کی تردید اور اسلام کی حقانیت کے اثبات میں غیر معمولی کمال بہم پہنچا لیا۔

فنڈر نے مناظرے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر وزیر خاں نے مولانا رحمت اللہ کو [illegible] وہ دراصل فنڈر کو ایک مرتبہ ایسی شکست دینا چاہتے تھے کہ پھر اس کے لیے کہیں منہ دکھانے کا موقع باقی نہ رہے۔

مناظرہ

۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ / ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو آگرہ میں مناظرے کا انتظام ہوا۔ چونکہ یہ بڑے معرکے کا مناظرہ تھا، اس لیے ہندوستان کے اکثر حصوں کے علماء، امراء اور عام لوگ آ کر پہنچے۔ بڑے بڑے انگریز افسر بھی شریک مجلس تھے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے دو دو مناظر مقرر ہوئے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اول پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ۔ مسلمانوں کی طرف سے مناظر اول مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں ہوئے۔ فیض احمد بدایونی بھی اس مناظرے میں مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے معاون تھے۔ موضوع مناظرہ یہ تھا مسلمان ثبوت رسالت صلعم اور محفوظیت قرآن کے دلائل دیں نیز تثلیث کا ابطال کریں اور ثابت کریں کہ انجیل و تورات محرف ہیں۔ عیسائیوں کا موقف اس کی ضد تھا

مفتی انتظام اللہ کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں:

پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی، انجیل و تورات کی تحریف کا تھا۔

---

* بیان کیا جاتا ہے کہ [illegible] آگرہ گئے تھے تو پہلی نشست میں تیار پذیر ہوتے تھے [illegible]

بحث و تمحیص کے بعد علانیہ سب کے سامنے پادری فنڈر کو اعلان
کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں (انجیل و تورات) محرف ہو چکی ہیں لیکن صرف
مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب
کو خود مشکوک مان رہا ہے اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو
سکتے ہیں۔ الغرض شکست فاش کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے
اٹھنا پڑا اور آگرہ سے چلتا بنا[1]

غرض ہندوستان میں پادری فنڈر اور دوسرے پادریوں کو ناکام بنانے والے مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان ہی تھے۔ پھر یہ ذوق عام ہوا۔ سینکڑوں، ہزاروں مسلمانوں نے عیسائیت کی کتابوں سے گہری واقفیت حاصل کر لی، اور عیسائیوں پادری مبلغوں سے مناظرے کرنے لگے۔

جنگِ آزادی

میرٹھ میں ہنگامہ برپا ہوتے ہی مظفر نگر میں حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور مختلف قصبوں میں آزادی کا پرچم بلند کر دیا تھا مثلاً تھانہ بھون، کیرانہ، شاملی، بڑھانہ وغیرہ۔ مولانا رحمت اللہ تو کیرانہ میں مجاہدین کی فوج کے سالار تھے۔

مجاہدین کیرانہ میں مسلمان گوجروں کی کثرت تھی اور ان کی قیادت چودھری عظیم الدین[2]

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء [illegible] مولانا نے انجیل و تورات کے کئی متعدد نسخے کھول کر رکھ دیے تھے۔ اور ہر نسخے کی عبارتیں پڑھ پڑھ کر اختلافات کے ثبوت دیتے جاتے تھے، اس بحث پر سب حیران رہ گئے، پھر فنڈر اور مولانا میں خط و کتابت بھی ہوئی۔ خط و کتابت میں [illegible] نے چھپ دی تھی، مناظرہ کی روداد بھی [illegible] نے شائع کی (تحریک آزادی ص [illegible])

[2] مسلم گوجر چودھری عظیم صاحب بھی مولانا رحمت اللہ کی طرح حجاز چلے گئے تھے

بنیز آتی تھیں، انھیں دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے:

مولوی رحمت اللہ اس گروہ میں آنے لگے دہلی میں جہاد
کی صورت کیا ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے، عیسائی
مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس
مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانشمند مولوی کے
نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی، بلکہ ایک
ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلے گئے۔[1]

غورطلب حقائق

ظاہر ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب دہلی میں مجاہدین کی خاص تعداد جمع ہو چکی تھی اور مقابلہ ہو رہا تھا۔ مطلب یہ کہ مولانا نے اپنے ہاں جہاد کا بندوبست کرنے کے علاوہ اس امر کی بھی کوشش کی کہ دہلی کے مرکز کی حالت دیکھیں، اسے ہر ممکن ذریعے سے تقویت پہنچائیں یا باہمی مشورے سے تنظیمات کا بندوبست کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ علمائے کرام کے نزدیک یہ ہنگامہ بے ضابطہ تھا، ورنہ اسے وہ نتیجہ خیز قرار دے سکتے تھے۔ وہ صحیح اصول و ضوابط کے مطابق انگریزوں سے روک کر انھیں نکالنا چاہتے تھے۔ یہ غرض بھی کہ بے وجہ قتل و غارت کا طوفان اٹھ گیا۔ مولانا نہ مل سکے تو انگریزوں نے انھیں مفرور قرار دیا اور گرفتاری کے

ہجرت

لیے گراں قدر انعام کا اعلان کر دیا۔ اب مولانا کے لیے بچ نکلنا اور

[1] ذکاء اللہ، صفحہ ۶۴۲۔ یہ بیان درست ہے تو یقیناً اس سے مولانا رحمت اللہ کی بالغ نظری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسے مقاصد واجب جہاد سے کوئی مناسبت نہیں۔ بعض دوسرے بالغ نظر لوگوں کا احساس بھی یہی تھا، لیکن جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا، ان کا جذبہ ان کی رائے یہ تھی کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا مناسب نہ ہوگا اور مصلحت بہرحال سعی و حمیت ہی کی متقاضی ہے۔

بزرگانِ دیوبند

پہلا درجہ

بزرگان دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اوّلین درجہ احترام و اعزاز حاصل ہے، وہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ، حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی اس سرزمین کے آسمان پر ان درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں، جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں سافروں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستے بتاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے مشعل بردار تھے، جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے، جو دلوں اور روحوں میں دینِ حقہ کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار ——— دار العلوم دیوبند ——— ایسی ہے جو قریباً ایک صدی سے پاک و ہند کی وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام و بقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں دائروں میں قابلِ فخر ہیں۔

ان بزرگوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں حصہ لیا تھا، افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں اور جن حضرات نے کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی، وہ بعض وقتی مصالح سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جو کچھ کہا، اس سے صورتِ حالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔

مولانا عاشق الٰہی کا بیان

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی واقعات کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ قاضیوں کے جس خاندان کو تھانہ بھون میں رئیس اعظم کی حیثیت حاصل تھی، اس میں سے قاضی سعادت علی خاں پسر قاضی نجابت علی خاں کے دو فرزند تھے، ایک قاضی عنایت علی خاں اور دوسرے قاضی عبدالرحیم خاں۔ بڑے بھائی نے جاگیر کا پورا کام سنبھال لیا تھا۔ چھوٹا بھائی اطمینان سے امیرانہ زندگی گزار رہا تھا دونوں میں باہم بے حد محبت تھی، گویا ایک دوسرے کے جاں نثار اور عاشق زار تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں یک مرتبہ قاضی عبدالرحیم خاں چند احباب کے ساتھ ہاتھی خریدنے کی غرض سے سہارن پور گیا اور کسی سرائے میں ٹھہر گیا۔ ایک بنئے کو بیچارے عبدالرحیم سے دشمنی تھی اس نے سپنکی صاحب[1] کے پاس رپورٹ کردی کہ دیکھیے تھانہ بھون کا رئیس بھی باغی ہوگیا ہے اور اس کا بھائی اس غرض سے ہاتھی خریدنے آیا ہے کہ دہلی بھیجے وہ کئی روز سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

خونِ ناحق

یہ افواہ گلی کوچوں میں بھی پھیل گئی نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے انگریزوں نے ایک گارد عبدالرحیم خاں اور اس کے احباب کی گرفتاری کے لیے سرائے میں بھیج دی اور بے گناہوں کو گرفتار کرکے جیل میں پہنچا دیا بغاوت کا مقدمہ چلا اور کوئی ناص ثبوت فراہم کیے بغیر عبدالرحیم خاں اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت تھی، جو اس غرض سے سات ہزار میل کا فاصلہ طے کرکے یہاں آئی تھی کہ حق و انصاف کی بخشش کا فرض انجام دے[2]

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

---

[1] SPANKIE صحیح نام ہے سہارن پور کا سول افسر تھا۔ مولانا عاشق الٰہی نے اسے سپنکی لکھا ہے

[2] تذکرۃ الرشید جلد اوّل ص ۷۵

کی پریشانی میں گھر بار اور زندگی تباہ کر ڈالی۔

مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ اس بدامنی کے زمانے میں لوگ حضرت حاجی امداد اللہ مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے دینی سردار ہیں دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر پر رکھیں۔ چنانچہ حضرت کو ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ چونکہ حکومت کے فیصلوں، ورشرعی قضا میں مولویوں کی ضرورت تھی، اس لیے مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم بھی تھانہ بھون ہی میں حضرت حاجی صاحب کے پاس ٹھہر گئے۔[۱]

ایک واقعہ

مولانا عاشق علی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب مولانا رشید احمد صاحب مولانا قاسم اور حافظ ضامن کا ایک مقابلہ بندوقچیوں سے ہو گیا:

> یہ بزرگ چونکہ سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے
> سے بھاگنے یا ہٹ جانے والے نہ تھے، اس لیے اٹل پہاڑ کی
> طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا
> اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر
> کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں
> چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے
> ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں چنانچہ
> آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ
> زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔[۲]

---

[۱] تذکرۃ الرشید حصہ اول صـ [illegible] [۲] ایضاً صـ [illegible]

مبادا "سرکار کے باغیوں" کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو، یہاں "سرکار" سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرف دار ہو رہے تھے لیکن "سرکار" کا لفظ ایسے طریق پر استعمال کیا کہ بظاہر اس سے حکومت مراد لی جا سکتی ہے۔ کتاب "تذکرۃ الرشید" ایسے زمانے اور ایسے حالات میں مرتب ہوئی تھی جب انگریزوں کا اقتدار اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا اور نازک واقعات کی ترتیب میں موزوں طریق و اسلوب سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں، نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی؟

حافظ محمد ضامن

حافظ محمد ضامن جو میرے اندازے کے مطابق انگریزی لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے تھانہ بھون کے باشندے اور حضرت حاجی صاحب کے خواجہ تاش یا پیر بھائی تھے، یعنی دونوں بزرگ حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے مرید تھے۔ حافظ صاحب کے کمالات کا اندازہ بعض روایات سے ہو سکتا ہے، مثلاً:

۱۔ جب کوئی شخص ان کے پاس آتا تو فرماتے، بھائی اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو مولوی شیخ محمد صاحب تشریف رکھتے ہیں، مولوی صاحب سے پوچھ لے۔ اگر تجھے مرید ہونا ہے تو وہ بیٹھے ہیں حاجی صاحب ان سے مرید ہو جا۔ اگر حقہ پینا ہے تو ہمارے پاس بیٹھ رہ۔[1]

۲۔ پیر و مرشد حضرت میاں جی صاحب کے ہمراہ ان کا جوتا بغل میں لے کر دو تین دن میں ڈول (؟) جھنجھانہ جاتے۔ حافظ صاحب کے صاحبزادے کی شادی تھی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس حالت میں جانا مناسب نہیں، ہو سکتا ہے کہ سمدھی یہ خیال کر کے کہ کوئی غیرت نہیں رشتہ توڑ دیں۔ حافظ صاحب نے فرمایا:

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ۱۵۰

سو(ئم) مہر صاحب کی غلط بیانی ملاحظہ ہو۔ شروع ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جب حضرت امام ربانی گنگوہی قدس سرہ پر سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک ہونے کی تہمت باندھی

رشتے کی پروا نہیں، لیکن میں جس طرح سمجھتا ہوں، اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں، اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔"

میلی سن کا پیش کردہ نقشہ

اب آپ میلی سن کا پیش کردہ نقشہ سامنے رکھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ شاملی کے ایک ہندو زمیندار مہار سنگھ نے ہنگامہ بپا کیا تھا اور دربار دہلی سے تعلقات مکاتبت پیدا کر لیے تھے۔ انگریز اسے دبا نہ سکتے تھے، البتہ شاملی کو ضلع بغاوت سے محفوظ رکھا پھر سپنکی صاحب نے گورکھوں کا ایک جیش بھیج دیا اور ایڈورڈز نے اس کمک سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر قبضہ کر لیا۔ اس پر قناعت نہ کی بلکہ اپنے ایک وفادار مسلمان ماتحت ابراہیم خاں کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ شاملی میں چھوڑا اور ایڈورڈز خود بڑھانہ چلا گیا۔ یہ ۱۴ ستمبر کا واقعہ ہے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قاضی عنایت علی خاں نے اپنے جانباز جوان ساتھ لیے اور شاملی پر حملہ بول دیا۔ ابراہیم خاں نے مقابلہ کیا لیکن آخر وہ تحصیل کی ڈیوڑھی پر محصور ہو گیا۔ میلی سن لکھتا ہے کہ ابراہیم خاں کے ساتھ عہد ہوا تھا کہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جان کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، لیکن حوالگی کے بعد ایک سو تیرہ آدمیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔[1]

بعد کے حالات

ایڈورڈز[2] کو یہ خبر ملی تو اسے بڑا غصہ آیا، لیکن مظفر نگر سے تشویشناک خبریں ملیں تو ادھر چلا گیا۔ بعد ازاں ایک جیش تھانہ بھون بھیجا گیا جو سکھوں اور گورکھوں پر مشتمل تھا۔ کیپٹن سمتھ اور لیفٹیننٹ کیو اس کے کمانڈر تھے۔ چونکہ اس جیش کی تعداد کم تھی، اس لیے مجاہدین نے اسے مار بھگایا۔ مزید چند روز گزر گئے تو ڈنلاپ آیا۔ تھانہ بھون پر قبضے کے بعد وہ شاملی پہنچا اور وہاں بھی انگریزی حکومت بحال کر دی

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ۱۵۹ [2] میلی سن جلد ششم ص ۱۲۴

میٹکاف نے حکم دیا تھا کہ تمام مقدمے سول افسروں کے سامنے پیش ہوں اور سزا صرف انہیں لوگوں کو دی جائے جن کے خلاف ارتکاب جرم قطعی طور پر ثابت ہو جائے۔ مولانا کے خلاف ایسے ثبوت کا کوئی بھی امکان نہ تھا لہٰذا وہ سزا سے محفوظ رہے۔

"تذکرۃ الرشید" میں تین مخبروں کا ذکر جا بجا آیا ہے۔ جنھوں نے مولانا کے متعلق مخبری کی یعنی قاضی محبوب علی خاں تھانوی، غلام علی ساکن قصبہ علی پور، اور حکیم احمد یہ بخش رامپوری۔

رات سے جو اعلیٰ ملبوسات تقسیم کے لیے گئے تھے، ان میں سے ایک بیش قیمت لباس بہ کمال اصرار نواب کی نذر کیا۔[1]

پھر شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال نے نواب کے لیے ایک رقم مقرر کر دی۔ میرا خیال ہے کہ یہ انتظام نواب صدیق حسین خاں ہی کی تحریک پر ہوا۔ معمول یہ تھا کہ نواب ظہر کے اول وقت حرم شریف میں آتا اور عشا پڑھ کر گھر جاتا۔

۱۲۸۸ھ میں وفات پائی اور مکہ کی خاک مقدس میں آسودۂ خواب ابدی ہے۔

نواب سخاوت حسین

معاملہ نواب تفضل حسین پر ختم نہ ہوا بلکہ ان کے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کو بھی ۱۸۵۷ء ہی کے واقعات کی پاداش میں انگریزوں نے پھانسی کی سزا دی۔ منیر شکوہ آبادی نے اس حادثۂ الیمہ کی تاریخ کہی:

---

[1] "مآثر صدیقی" یعنی نواب صدیق حسن مرحوم کے سوانح جو ان کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں نے مرتب فرمائے۔ حصہ دوم ص ۱۰۰،۹۹۔

نواب علی حسن خاں نے خدا جانے کس وجہ سے اس واقعے کو نواب تجمل حسین خاں سے منسوب کر دیا، حالانکہ وہ ۱۸۶۴ء میں وفات پا چکے تھے۔ یہ واقعہ نواب تفضل حسین خاں کا تھا۔ شاید مجتبیٰ آزادی کے فاضل مولف نے معلوم نہیں کیوں اس واقعے میں بے اصل بہ لفظ مزید یہ تصرف فرمایا یعنی کہا کہ نواب صدیق حسن خاں کو معظمہ پہنچے تو نواب تفضل حسین خاں بھی فقیروں کی صف میں کھڑے ہوئے تھے اور شریف گداگروں کے مستحق امداد تھے۔ نواب صدیق حسن یہ حال دیکھ کر دوڑ پڑے۔ تفضل حسین کو اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور ایک نیا جوڑا پہنا کر دیا (ص ۲۲۰)

مآثر صدیقی میں کہیں یہ تفصیل مذکور نہیں، صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں خود وہاں سے جا کر ملے اور ایک بیش قیمت پوشاک بہ کمال اصرار ان کی نذر کی۔ بلاشبہ تفضل حسین خاں شکستہ حال و حاضر تھے، لیکن ان کی غیرت کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ فقیروں کی صف میں کھڑے ہو کر مستحق امداد ہوں۔

غازیوں کی ترکتاز

خان بہادر خان کی فوج میں ایک جیش غازیوں کا بھی تھا جو حلف اٹھا چکے تھے کہ خود مریں گے اور دشمن کو ماریں گے۔ جب تک زندگی کی رمق باقی ہے، ہم وار نہ چھوڑیں گے اور نہ پیچھے ہٹیں گے۔ عین اس موقع پر اسی جیش نے حملہ کیا۔ عینی شاہد کا بیان ہے کہ وہ لوگ بڑے وجیہ تھے۔ جوانی ڈھل چکی تھی اور بڑھاپا شروع ہو چکا تھا۔ داڑھیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ سبز رنگ کی پگڑیاں اور سبز رنگ کے کمربند باندھ رکھے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں، جن پر آیات منقوش تھیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار بجلی کی تیزی سے حملے کے لیے آئے۔ سر نیچے کر رکھے تھے اور انھیں ڈھالوں سے چھپا رکھا تھا، تلواریں بلند تھیں۔ "دین" "دین" پکار رہے تھے[۱] اور اس گاؤں پر حملہ آور ہوئے جہاں پنجابی سکھوں کا لشکر جما بیٹھا تھا۔ سکھ اس سیل کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہ نکلے۔ پھر غازی گما گرا پلٹن پر جا گرے۔ میلی سن کہتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی واپس نہ ہوا۔ سب نے میدان جنگ ہی میں جانیں دے دیں۔ تین غازی برگیڈیر کیمرون[۲] پر جا گرے اور اسے گھوڑے سے کھینچ کر نیچے گرا لیا۔ اس کی موت میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ عین وقت پر دو غازی سنگین سے شہید ہو گئے اور ایک گولی سے۔ اسی طرح برگیڈیر وال پول کی جان بڑی مشکل سے بچی۔[۳]

ایک اور چال

اب بظاہر انگریزوں کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا تھا، لیکن یکایک کالن کیمبل نے اپنی فوج کو ٹھہر جانے کا حکم دے دیا۔ کیوں؟!

۱؎ انگریز مورخوں نے بار بار "دین" "دین" کے نعرے کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسا کوئی نعرہ مروج نہ تھا۔ وہ نعرۂ تکبیر کہتے تھے۔ بعض لوگ حضرت علی مرتضیٰ کی دلاوری کے جوش اتباع میں "یا علی" بھی پکارتے تھے۔

۲؎ CAMERON

۳؎ میلی سن جلد چہارم ص ۳۲۰، ۳۲۱

میں نے از خود بغاوت پر کمر نہیں باندھی۔ سرکار انگریزی میں فوج باغی ہو گئی اور جس ملک کا جو دعوے دار تھا، اس کا زمیں گردانا گیا۔ بریلی، شاہ جہان پور، پیلی بھیت وغیرہ یعنی کل روہیل کھنڈ ہمارا موروثی ملک تھا۔ اس وجہ سے بخت خاں اور مجبور رعایا نے مجتمع ہو کر مجھے مسند نشین ریاست کیا۔ میں نے بلوانہ کرایا اور نہ کسی انگریز زن و بچہ کو قتل کیا۔ جس وقت آپ صاحبان نے دشمن کے ظلم سے مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیا تب میں نے قبضہ کیا۔ باقی بلوائیوں کی روک تھام اس دم میرے اختیار میں نہ تھی، انھوں نے جو چاہا سو کیا۔

بعد ازاں لڑائیاں جا بجا سر میدان میری اور آپ کی فوج کی البتہ ہوئیں۔ اس میں طرفین کا کشت و خون ہوا۔ اس میں میری کیا خطا ہے۔

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند!

اب آپ کے بس میں ہوں، جو چاہیے میری نسبت حکم دیجیے۔[1]

تبصرہ

خان بہادر خاں پر بعض انگریزوں کے قتل کا بھی الزام تھا اس کے جواب میں انھوں نے جو کلمات عذر فرمائے تھے اور جو کچھ کہا تھا وہ یقینی اور قطعی طور پر درست تھا یعنی نواب نے نہ کسی عورت یا بچے کو قتل کرایا، نہ کسی انگریز افسر کو بطور خود سزائے موت دی۔ سپاہ تمام تر میں اپنے رئیسوں اور حاکموں کی بات مانتی تھی لیکن انگریزوں

---

۱ تاریخ سیرفی و مراد جات حافظ رحمت خاں ص ۲۶۳، ۲۶۴

تاہم یہ چپ چاپ اُٹھے اور حضرت محل کی قیام گاہ سے قریب ایک گھاٹی میں جا ٹھہرے
پھر یہ جنگ بہادر کے بھائی نے انہیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ خود جنگ بہادر آیا تو ممو خاں
سے پوچھا کہ کسی میم یا صاحب کو اپنے ہاتھ سے بھی مارا ہے؟ ممو خاں نے نفی میں جواب دیا
جنگ بہادر نے کہا کہ پھر مطمئن رہیے۔ ان دنوں میں ایک انگریز افسر آیا اور جنگ بہادر کی اجازت
سے ممو خاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ لے گیا۔

بتاریخ ۱۰ جمادی الاول ۱۲۷۶ھ بروز دوشنبہ (۵ دسمبر ۱۸۵۹ء) ممو خاں جیل خانے
میں داخل ہوا۔ چیف کمشنر اور دوسرے بھی ساتھ ہی گرفتار ہوئے تھے۔ گویا ممو خاں نے حضرت محل
کے دفع ہونے کے بعد قریب ایک سال نیپال میں اس کے ساتھ گزارا۔[1]

مقدمہ اور سزا

مقدمہ پیش ہوا تو ممو خاں نے بڑے سچے جوابات دیے بہت
سی باتیں ایسی بھی بتائیں جن سے واضح ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کا
بدخواہ تھا۔ پہلے زمانے سے اس کو فرح بخش کے ایک کمرے میں رکھا گیا۔ غرض
کے لیے کچھ روپیہ مقرر ہوا اور خدمت گار بھی ساتھ رہنے لگے۔ کئی مہینے کی پیشیوں کے
بعد پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ بعد ازاں کیمبل کے پاس اپیل ہوئی تو اس نے موت کی سزا کو انڈیمان
میں قید کی سزا سے تبدیل کر دیا۔ چنانچہ ممو خاں کو انڈیمان بھیجا گیا۔ راستے میں جہاز سے اتر کر
بھاگا مگر پکڑا گیا۔ اسی وجہ سے اس کی سزا حبس دوام کی شکل اختیار کر گئی۔[2]

آخری دور

راوی محمد جعفر تھانیسری ۱۸۶۶ء میں انڈیمان پہنچے تھے۔ وہ لکھتے ہیں
کہ جس زمانے میں کرنیل فورڈ انڈیمان کا سپرنٹنڈنٹ تھا،

> پچاس نفر قیدیان بغاوت واسطے مدد راجا مدوکس صاحب
> کے ۱۰ دسمبر ۱۸۶۳ء کو جزیرہ سراک بھیجے گئے کہ ان میں
> ممو خاں نائب بیگم صاحبہ والدہ برجیس قدر بھی تھے کہ مراد کی ہیں

[1] تاریخ … جلد دوم ص ۲۹۰ [2] ایضاً ص ۲۹۲

جا کر فوت ہو گئے۔[1]

گویا نواب تفضل خاں کی حیاتِ اسیری کے قریباً پانچ سال انڈیمان میں بسر ہوئے، پھر وہ سرا وک چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

جیمی گرین | اصل نام محمد علی خاں تھا کہتے ہیں کہ نواب نجیب الدولہ مرحوم کا پوتا تھا بریلی میں تعلیم پائی۔ رڑکی سے انجینئری کا امتحان پاس کیا۔ اگرچہ امتحان میں انگریزوں سے بھی زیادہ نمبر حاصل کیے تھے مگر ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ملازمت بہت معمولی ملی پھر ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو انجینئری میں معمولی حیثیت کا مالک تھا آخر استعفیٰ دے کر جیمی گرین اودھ پہنچا۔ اس زمانے میں نیپال کا مختار جنگ بہادر ولایت جا رہا تھا، اسے ایک انگریزی داں سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ محمد علی خاں کو انگریزی میں خاص کمال حاصل تھا چنانچہ مہاراجا کے ساتھ ولایت گیا دوبارہ عظیم اللہ خاں کے وفد میں شریک ہو کر ولایت کا سفر اختیار کیا کہ نانا نے پنشن کے سلسلے میں بھیجا تھا۔ عظیم اللہ خاں کے ساتھ طلب علم کے زمانے سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔

۱۸۵۷ء میں جیمی گرین لکھنؤ پہنچا اور وہاں حضرت محل کی حکومت میں چیف انجینئر مقرر ہوا انگریزی فوج کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیس بدل کر کانپور گیا۔ فوج میں پھیری کرتا ہوا گرفتار ہوا اور جاسوسی کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی۔[2] وہ عموماً اصل نام محمد علی خاں سے نہیں بلکہ اختیار کردہ نام جیمی گرین سے مشہور رہے۔

---

[1] تواریخ عجیب ص ۲۴۳-۲۴۴

[2] ماخوذ از ۱۸۵۷ء جنگِ آزادی نمبر

کی جانیں بچائیں۔ لارڈ کیننگ نے بعد میں لکھا کہ دیوانی کے کسی افسر نے ولسن کے برابر سیکڑوں کی جانیں نہ بچائیں۔ بعد میں وہ نیوزی لینڈ جا بسا تھا اور وہاں ایوان کے نمائندگان کا ممبر بنا رہا۔ ۱۸۹۱ء میں وفات پائی۔[1] مولانا کفایت علی کی سرگرمیوں کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ مرادآباد میں انہیں صدر الصدور بنا دیا گیا تھا اور آپ نے شرعی احکام جاری کیے۔ آنولہ (ضلع بریلی) بھی گئے اور وہاں حکیم سعید اللہ کے پاس ٹھہرے۔ اس اثنا میں نشر و تبلیغ جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔[2]

معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جان بچ گئی۔ کچھ معلوم نہیں کب وفات پائی۔ ایک بیان منظرِ عام پر آیا ہے کہ ان کی قبر سڑک میں آ گئی تھی۔ مولوی محمد نعیم مرادآباد کے نانا شیخ برکت علی نے ان کی میت نکلوا کر جیل کے عقب میں دفن کرائی۔[3]

عبد الغفور خاں نساخ نے "سخن شعرا" مرتب کی تھی تو مولانا زندہ تھے۔ چنانچہ نساخ لکھتے ہیں:

> صاحبِ علم و فضل و زہد و ورع ہیں۔ بیشتر شعر ان کے حمد و نعت میں ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی حضرت مولانا کافی کی نعتیں بڑے شوق سے سنتے تھے کہا کرتے تھے کہ وہ سلطانِ نعت ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "بہار خلد" بتائی گئی ہے یعنی ترمذی کا منظوم ترجمہ۔ اس کا ایک نسخہ ۱۲ صفر ۱۲۵۷ھ / ۱۵ اپریل ۱۸۴۱ء کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ ۱۸۶۸ء میں دوسری مرتبہ شائع ہوا تھا۔

مولانا کو طب میں بھی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے طب کی تعلیم مولوی رحمان علی صاحب

۱؎ ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی بک لینڈ ۲؎ مشاہیر جنگ آزادی ص ۲۲۱

۳؎ مشاہیر جنگ آزادی ص ۲۲

۲۔ عبد اللطیف خاں کا چچا جسے پھانسی کی سزا دی گئی۔

۳۔ اسماعیل خاں جسے چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۴۔ مہدی بخش، اسے بھی چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۵۔ قاضی وزیر علی کی جائداد ضبط کر لی گئی، اس لیے کہ اس نے

منصب قضا کا کام انجام دیا تھا۔

رفیقوں میں ایک لچھمن سنگھ کا نام بھی آیا ہے۔ غرض جائدادیں سب کی ضبط ہوئیں۔ مارگڈہ کا قلعہ بارود سے اڑا دیا گیا اور اس سلسلے میں ایک انگریز افسر اور کچھ سپاہی بھی مارے گئے ولی داد خاں کی جائداد بھی ضبط ہو گئی۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی

مفتی عنایت احمد، بن منشی محمد بخش، بن منشی غلام محمد بن منشی لطف اللہ۔ ان کی ولادت بہ مقام دیوہ ۹ر شوال ۱۲۲۸ھ ر اکتوبر ۱۸۱۳ء کو ہوئی۔ تحصیل علم کے لیے پہلے رام پور گئے، جہاں مولوی سید محمد علی رام پوری اور مولوی سید حیدر علی سے پڑھتے رہے۔ پھر دہلی جا کر شاہ اسحاق سے حدیث کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھ کر سند حاصل کر لی بعد ازاں علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی سے معقول و منقول کی تعلیم حاصل کی ایک سال تک مولانا بزرگ علی کے مدرسے میں مدرس رہے پھر منصف اور مفتی مقرر ہوئے۔ وہاں سے بہ حیثیت صدر امین بریلی میں تبادلہ ہو گیا۔ آخر ترقی کر کے آگرہ میں صدر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس اثنا میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ افراتفری کے باعث آگرہ نہ جا سکے، بریلی اور رام پور ہی میں قیام رہا۔ بغاوت کے اہتمام میں مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا ملی[۵۸]

انڈیمان کی زندگی

انڈیمان میں ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، تاہم حافظے کی بنا پر علم صیغہ، تواریخ حبیب الٰہ وغیرہ کتابیں مرتب کر دیں۔ پھر ایک

---

[۵۸] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۰۱

توپ خانہ بریلی پر قبضہ کیا اور علم سبز لہرا دیا۔ نواب بہادر خاں
کے ساتھیوں میں ہو کر انگریزوں سے لڑتا رہا۔ آخری زندگی
کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔[1]

لال بہادر خاں میواتی

اصل وطن الور تھا۔ کچھ مدت الور میں ملازم رہا، پھر سرکار انگریزی
میں بھی ملازمت کی۔ اس کے رشتہ دار فتح پور سیکری
میں مقیم تھے۔ جب ہر طرف ہنگامے شروع ہو گئے، نیمچ اور نصیر آباد کی فوجیں آگرہ پہنچیں تو
لال بہادر خاں بھی ساتھ ہو گیا اور آگرہ کے قلعے تک پہنچ کر لوٹا۔ دہلی کی تسخیر کے بعد انگریزی
راج کی فوج آگرہ بھیجی گئی۔ میواتیوں نے فتح پور میں جم کر مقابلہ کیا۔ آخر انگریز کامیاب ہوئے اور
میواتیوں کو بری طرح تباہ کیا گیا۔ آگرہ سے دو شالہ مراکش نے میواتیوں کی سرکردگی قبول کر لی
تھی، انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے پھانسی دے دی۔ لال بہادر خاں ہاتھ نہ آیا۔[2]

اصحاب پٹنہ

پٹنہ میں افراتفری کی خبریں پھیلیں تو مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور
مولوی واعظ الحق کو بلا کر نظر بند کر دیا گیا۔ پھر ایک مجسٹریٹ مولوی مہدی
کو شبہات میں گرفتار کر لیا گیا۔ وارث علی ترہٹ میں پکڑا گیا اور اس کے قبضے سے خط نکلے جنہیں
باغیانہ قرار دیا گیا اور معلوم ہوا کہ پوری تحریک کی روح رواں مولوی کریم تھا جو پٹنہ سے قریباً زیل
کے فاصلے پر رہتا تھا اور بڑا ذی اثر مانا جاتا تھا۔ اسے بروقت خبر مل گئی اور گرفتار نہ ہو سکا۔
ہنگامہ ختم ہونے کے بعد مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق رہا ہو گئے۔
آخر الذکر مکہ معظمہ چلے گئے۔ مولانا احمد اللہ، ان کے بھائی مولانا یحییٰ اور مولانا عبدالرحیم کو ۱۸۶۴ء
اور ۱۸۶۵ء کے مقدمات میں بجرم اعانت مجاہدین ضبطی جائداد اور حبس دوام بعبور دریائے
شور کی سزا ملی۔ وارث علی کو پٹنہ میں پھانسی دی گئی۔ پیر علی خاں لکھنوی، شیخ گھسیٹا اور لطف

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۴۰، ۱۴۲ [2] ایضاً ص ۱۴۳

اپیل کی گئی تھی۔ بعد میں جلسے ہوتے رہے۔ ۱۶؍ جولائی کو ایک بڑے ہجوم نے ریزیڈنسی پر حملے کی تیاری کی، مولوی علاؤ الدین اس کے لیڈر تھے۔ راستے میں طرہ باز خاں روہیلہ جمعدار بھی اپنے آدمیوں کو لے کر حملہ آوروں میں شریک ہو گیا۔ ریزیڈنسی سے توپیں چلنی شروع ہوئیں حملہ آور پہلے پہل اِدھر اُدھر چھپ گئے، پھر منتشر ہو گئے، مولوی علاؤ الدین اور طرہ باز خاں کی گرفتاری کا حکم صادر ہو گیا اور وہ روپوش ہو گئے۔

۲۲؍ جولائی کو طرہ باز خاں گرفتار ہوا۔ وہ بیچارا مقابلے میں سخت زخمی ہو چکا تھا۔ مقدمے میں اس کے لیے کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں وہ قید سے نکل بھاگا اور جنگل میں چلا گیا۔ تعاقب کیا گیا۔ دوبارہ گرفتاری سے بچنے کی کوشش میں شہادت پائی۔ نعش حیدر آباد لائی گئی۔ بعد شہادت اس کے پاس سے دو تلواریں، ایک طمنچہ، دس روپے اور کچھ آنے برآمد ہوئے۔ شہادت کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ ۲۴؍ فروری ۱۸۵۹ء کا واقعہ تھا۔

مولوی علاؤ الدین کے لیے بھی کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی تھی۔ سزا کے وقت اس کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ چنانچہ وہ انڈیمان گیا اور سرسٹھ سال کی عمر میں وہیں وفات پائی۔ گویا کہ بتیس سال انڈیمان میں گزارے۔ بارہا رہائی کے لیے درخواستیں بھیجی گئیں لیکن کوئی درخواست منظور نہ ہوئی۔ مولوی علاؤ الدین کا تعلق ایک پرانے علمی گھرانے سے تھا اور وہ خود اعلیٰ پائے کا عالم اور پرہیز گار بزرگ تھا۔

حکیم محمد عبد الحق

حکیم محمد عبد الحق بن محمد حسن بخش، اصل وطن دہلی تھا۔ مدت تک راجہ ناہر سنگھ والی بلبھ گڑھ کے ایجنٹ رہے[1]۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم لکھتے ہیں کہ بلبھ گڑھ میں دیوانی پر مامور تھے، خوب روپیہ پیدا کیا اور مالدار ہو گئے۔ پھر

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۳۰

ملازمت سے مستعفی ہو کر گھر آ گئے ۔ چونکہ میرزا احمد اور جے سنگھ راؤ کے رد کرنے کی وجہ سے نواب حامد علی خاں کے ہاں آنا جانا تھا اس لیے پھانسی دی گئی

میرٹھی ریکارڈس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں حکیم صاحب بہادر شاہ کے ایڈیکانگ بن گئے تھے ۔ ان کے ماتحت چار سو سواروں اور پیادوں کا لشکر تھا ، جو انگریزی فوج سے لڑا ان میں سے دس بارہ مقتول و مجروح ہوئے ۔ اس فوج میں حکیم صاحب کا ایک عزیز اکبر علی جمعدار تھا ۔ وہ بھی زخمی ہوا تھا اور زخموں کی وجہ سے وفات پائی [1]

حکیم صاحب باقاعدہ دربار میں حاضر ہوتے تھے ۔ وہ اس کمیٹی کے ممبر تھے جو جنگ کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی ۔ ضلع گڑگانوہ کا انتظام ان کے سپرد تھا [2]
بہادر شاہ کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا بلبھ گڑھ نے ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء کو ایک عرضی دی تھی ، جس میں مختلف آدمیوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ روپیہ لے کر دہلی چلے گئے ۔ اس میں حکیم عبدالحق کے خلاف دس لاکھ روپے کا الزام لگایا گیا تھا [3] ایک مقام پر ذکر ہے کہ حکیم صاحب دربار میں آئے اور پانچ روپے نذر کے طور پر پیش کیے [4]

ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا دی گئی [5]

جنرل نیاز محمد خاں

یہ بھی بڑے مجاہدوں میں سے تھا ۔ خوب لڑتا رہا ۔ آخری شکست کے بعد کہ مکہ چلا گیا تھا ۔ کئی سال وہاں گزارے ، پھر ہندوستان آیا تو نواب جوناگڑھ کے پاس ملازم ہو گیا ۔ ۱۸۶۲ء میں یہ بمبئی گیا ہوا تھا ۔ وہاں پہچان لیا گیا ۔ گرفتار ہوا اور مقدمہ چلا جس میں پھانسی کی سزا ہوئی ۔ ہائی کورٹ نے سزائے موت کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا ۔ انڈمان ہی کی آغوش میں آسودہ ہے ۔

---

[1] میرٹھی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ دوم صفحہ ۲۶۲ [2] جلد ہفتم حصہ دوم صفحہ ۲۶۲

[3] بہادر شاہ کا مقدمہ مرزا نگر جی ص ۵۶ [4] ایضاً صفحہ ۱۰۲

[5] میرٹھی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ اوّل صفحہ ۲۶۲